تاریخ فقہ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ

(تیسری و آخری قسط)

علامہ محمد ابو زہرہ مصری — ترجمہ : معراج محمد بارق

فقہ اسلامی کے گزشتہ دو شماروں میں درج بالا عنوان پر ایک تاریخی و فکر انگیز تحریر آپ نے پڑھی' یہ علامہ محمد ابو زہرہ مصری کا وہ مضمون ہے جو علامہ احمد تیمور پاشا کے ایک مقالہ "نظرة تاريخية في حدوث المذاهب الفقهية الاربعة و انتشارها عند جمهور المسلمين" کے ساتھ قاہرہ سے ۱۹۶۹ء میں لجنہ نشر المولفات التیموریہ نے شائع کیا۔ قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی نے ہر دو مضامین کو اردو ترجمہ کے بعد کتابی صورت میں طبع کیا ہے اور اس کا نام "اسلامی دنیا میں فقہی مذاہب اربعہ کا فروغ" تجویز کیا ہے۔ جناب معراج محمد بارق (مالک قدیمی کتب خانہ) نے دونوں مضامین بڑی خوش اسلوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالے ہیں اور عربی عبارات کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے کسی تکلف سے کام نہیں لیا بلکہ خوبصورت بامحاورہ ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ قاری کو کہیں بھی ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا۔

جناب احمد تیمور کا مختصر تعارف اور ان کے اس مقالہ کے بارے میں شیخ ابو زہرہ مصری کی رائے زیر نظر (تیسری اور آخری) قسط میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ مگر اصل مقالہ کے مطالعہ کے لئے قدیمی کتب خانہ سے رجوع کرنا ہوگا جہاں خوبصورت دو رنگے سرورق کے ساتھ "اسلامی دنیا میں فقہی مذاہب اربعہ کا فروغ" نامی ۱۳۶ صفحات پر مشتمل کتاب دستیاب ہے اور اہل علم کی توجہ کی طالب ہے۔ تاریخ فقہ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے طلباء وباذوق قارئین اس کتاب میں اپنے ذوق کا سامان پائیں گے' تو لیجئے سر دست مطالعہ فرمایئے اس کتاب اور مؤلف کا تعارف علامہ محمد ابو زہرہ مصری کی زبانی.....(نور احمد شاہتاز)

علامہ احمد تیمورؒ کی تحریریں :

علامہ احمد تیمورؒ کی تحریر میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ہمارے زمانے میں

یہ خصوصیات صرف انہی کی تحریروں میں ملتی ہیں:

پہلی خصوصیت: درست الفاظ کا استعمال۔ انہوں نے جہاں بھی کوئی لفظ استعمال کیا ہے اس معنی کے لئے وہی لفظ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ اسی معنی کے لئے وضع ہوا ہے۔ دوسرے کسی لفظ کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس لفظ کو وہاں سے ہٹا کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیں تو عبارت کی وضاحت میں مشکل پیش آئے گی اور صحیح مطلب سمجھنے میں اُلجھن اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر ان کی عبارت کو اصل شکل میں رکھا جائے تو وہ نہایت آسان اور ہر لحاظ سے مکمل نظر آئے گی۔

دوسری خصوصیت: بغیر کسی جھول کے ایجاز۔ جب آپ ان کی تحریر پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ انہوں نے اس میں جس مطلب کو واضح کرنے کا قصد کیا ہے اس کے قلیل ترین حصہ کو بھی واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور یہ بھی بغیر کسی ابہام کے۔ اس قسم کا مکمل ایجاز دراصل اطنابِ مرسل سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اطناب میں تو یہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے معانی اور مطالب ذہن میں آتے جاتے ہیں لکھنے والا ان کو سپرد قلم کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتا کہ الفاظ وہ استعمال کئے جائیں جو مطلوبہ معانی سے زیادہ وسعت رکھتے ہوں اور ایسے مناسب و موزوں ہوں کہ دوسرا لفظ ان کی جگہ نہ آسکے۔ بغیر جھول کا ایجاز وہی ہوتا ہے جس میں الفاظ تھوڑے استعمال کئے جائیں لیکن معنی کے لحاظ سے وہ بہت جامع ہوں اور عبارت میں کوئی جھول بھی پیدا نہ ہو۔ اس مقام پر مجھے مرحوم سعد زغلول کا ایک جملہ بڑا بھلا لگتا ہے جو انہوں نے اپنے کسی دوست کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ اس خط میں اطناب تھا (یعنی مضمون کو بہت پھیلا کر بیان کیا گیا تھا) انہوں نے اس خط کے آخر میں لکھا: "میں نے اس خط میں جو اطناب سے کام لیا ہے اس میں مجھے معذور سمجھیں کیونکہ میرے پاس ایجاز کے لئے وقت نہیں ہے۔"

تیسری خصوصیت: عبارت میں پُر سکون جمال۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے جملوں میں الفاظ کی چمک دمک نہیں ہوتی، لیکن اکثر یہ عبارتیں الفاظ کے جمال اور حقائق و معانی کے جلال کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اندازہ ہی نہیں

لگا سکتا کہ آیا یہ عبارت صرف اپنے حسنِ معانی کی وجہ سے اچھی لگ رہی ہے یا اس میں الفاظ کے حسین لباس کے علاوہ بھی کوئی اور چمک دمک کا سبب ہے۔ اس جمال ورعنائی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر بڑی مرتب ہوتی ہے اور اس کی بندش چست ہوتی ہے۔ اس میں ہم آہنگی اور موزونیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

کتاب ''مذاہبِ اربعہ''

ماہ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں جامعہ قاہرہ کے ''لاکالج'' میں شرعی قوانین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈپلومہ کا کورس شروع کیا گیا کیونکہ اس کا وجود اس وقت کی علمی ضرورت تھی۔ جب اس کورس کے طلبہ شرعی قوانین کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کو اس موضوع پر ایک مقالہ لکھنے کو کہا گیا تو ان میں سے بعض طلبہ کو مصادر و مآخذ شریعت کا سمجھنا اور اس کی پیچیدگیاں حل کرنا دشوار معلوم ہوا۔ لہٰذا ایسی تدریس کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس سلسلے میں ان کی صحیح رہنمائی کر سکے اور ان کے لئے یہ کام آسان کر سکے۔ کیونکہ اب لوگوں کی نگاہیں قاہرہ کے ''لاکالج'' کی طرف لگی ہوئی تھیں تاکہ وہ علمِ شریعت کے اس تازہ اور میٹھے چشمہ سے سیراب ہو سکیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ قانون کے طلبہ کے لئے شریعت کی تعلیم کو بہت غور وخوض کے بعد آسان بنایا جائے تاکہ وہ اس سلسلے میں صحیح تحقیقی طریق کار پر گامزن ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ قدیم مجتہدین کے حالات و تعلیمات کے بارے میں تدریس کا آغاز کیا جائے تاکہ ماضی اور حال کو باہم ملایا جا سکے اور طلبہ مشرق کے نورِ علم سے اور اس کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو شریعت کے ڈپلومہ کا یہ کورس طلبہ اور محققین کی اُمیدوں کا مرکز بن گیا۔

اس کورس کے طریق کار کو طے کرتے وقت ماہرین قانون اور کالج کے اساتذۂ شریعت پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جس کے سربراہ ہمارے استاذ محترم جناب احمد ابراہیم مرحوم تھے، حسن اتفاق سے یہ علامہ احمد تیمورؒ کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور مشرق کے چیدہ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس کورس کو پڑھانے کا طریق کار یہ ٹھہرا کہ ہر سال مذاہب مشہورہ کے اماموں میں سے ایک مجتہد کو لیا جائے اور ان کے وہ اصول پڑھائے جائیں جو فقہ اسلامی کے فکری گوشوں میں سے ایک گوشہ تصور کئے جاتے ہیں، لیکن مصادر و مآخذ فقہ اسلامی سے زیادہ دور نہ جایا جائے اگرچہ ان مصادر کے گرد مختلف نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک انہی مصادر سے خوشہ چینی کرتا ہے اور انہی سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے، پھر درختوں اور پھلوں کی طرح بعد میں یہ مختلف رنگ اختیار کرتے ہیں، اگرچہ فی الجملہ ان کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے، کیونکہ ان کا سرچشمہ ایک ہے اور مٹی زرخیز ہے اور ان کے بیج ہم شکل ہیں، اور ان سب کا پھل صحت بخش ہے، وَبازدہ اور مضر صحت نہیں ہے۔

اس کورس کے سلسلے میں مجھے بھی ایک مجتہد کے بارے میں تحقیق کا کام سپرد ہوا۔ میں اس تحقیقی کام میں سیدھی راہ چلا، یا میں نے خیال کیا کہ یہی سیدھی راہ ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس مجتہد کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کثیر مواد بھرا پڑا ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ مواد ایک انبار نظر آیا جس میں ہیرے اور پتھر خلط ملط ہوگئے تھے اور ان کو چننا اور جانچنا آسان کام نہیں تھا۔ اور اصول و نظریات تو اور بھی نیچے دبے ہوئے تھے۔

اس تحقیقی کام میں یہ مشکل تو اپنی جگہ تھی، لیکن اس سلسلے میں اس سے بھی زیادہ جس تحقیق نے مجھے تھکا مارا وہ ان ملکوں اور شہروں کا تعین تھا جن کے باشندوں نے ان فقہی مذاہب کو قبول کیا، خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس مذہب کے زیر اثر علاقوں کا علم ہو جائے اور ان ملکوں اور معاشروں کا بھی علم ہو جائے جن کے رسوم و رواج اور عرف و عادات کو اس مذہب نے غیر منصوص امور میں لیا۔ کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے مسلمانوں کے حالات کا علم رکھنا ہے جو ہر ایسے مسلمان کے لئے ضروری ہے جو علوم اسلامی کا طالب علم ہو۔ نیز حدیث نبوی ﷺ میں بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ لَمْ یهتم بالمسلمین فلیس منهم۔

جس کو مسلمانوں کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے۔

بہر حال اس مقصد کے لئے میں نے تمام لائبریریوں کو چھان مارا میں اس سلسلے میں ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو زیادہ ضخیم نہ ہو بلکہ چھوٹی سی ہو۔ بالآخر مجھے میرے مقصد کی چند کتابیں مل گئیں جن میں سے بعض تراجم علماء پر مشتمل تھیں اور ایک علامہ احمد تیمور کی یہ کتاب "المذاہب الفقہیہ الاربعۃ" تھی۔ انہی کتابوں سے میری مشکل آسان ہو گئی اور مطلب حل ہو گیا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مذاہب اربعہ پر جن کتابوں کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے ان کی تحریر میں استاذ احمد تیمور مرحوم کی اس کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے، میں نے دیگر بہت سی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب میں، جو حجم میں چھوٹی اور مواد کے لحاظ سے بہت بڑی ہے، میں نے وہ حقائق و مضامین پائے جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں ہر بات بالکم و کاست مستند حوالہ سے بیان کی گئی ہے، یہ کام ایسے پختہ اور معتمد عالم کے بس کا ہوتا ہے جو خفی او جلی سب طرح کے حقائق کا کھوج لگانا جانتا ہو۔

کتاب کا جائزہ :

اس کتاب کا آغاز ایک مختصر سے مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے سرچشموں کا ذکر ہے۔ پھر وہ ائمہ اربعہ میں سے سب سے بڑے امام یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے مولد، وطن اور تلامذہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ ان شہروں اور ملکوں کے نام بیان کرتے ہیں جہاں جہاں ان کا مذہب پھیلا۔ ان کے اصحاب کے عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر تفصیل سے یہ بیان کرتے ہیں کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں ان کے مذہب اور دیگر مذاہب میں رقیبوں کی حیثیت سے مقابلہ ہوا۔ پھر خاص طور پر ملک مصر میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں اس مذہب کا مقام بیان کرتے ہیں، پھر سب ملکوں میں اس کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے کرتے ایسے ملکوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جہاں

یہ اقلیت میں رہا یا جہاں اس مذہب کے مقلدین کا صحیح تناسب معلوم نہیں ہو سکا یا جہاں اس کے وجود کا ہی علم نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:

"اب رہا دیگر شہروں اور ملکوں میں مذہب حنفی کے داخل ہونے کا حال تو اس سلسلے میں سب سے زیادہ معلومات ہمیں اس کے چوتھی صدی میں فروغ پانے کے حالات سے ہوتی ہے جس کو مقدسی نے اپنی کتاب "احسن التقاسم" میں ہر اقلیم کا حال بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یمن میں اہل صنعاء اور صعدہ کی اکثریت کا یہی مذہب تھا اور عراق کے اکثر فقہا اور قضاۃ کا بھی یہی مذہب تھا۔ ملک شام میں تو اس مذہب کو اس قدر تسلط حاصل تھا کہ وہاں کا کوئی قصبہ یا شہر بمشکل ایسا ملتا تھا جس میں کوئی حنفی نہ ہو۔ وہاں کے قضاۃ بھی اکثر حنفی ہوتے تھے، البتہ فاطمیوں کے دور میں وہاں اکثر امور فاطمی مذہب کے مطابق طے ہوتے تھے جیسا کہ فاطمی عہد میں مصر کا حال تھا۔"

پھر وہ اسی طرح ان علاقوں کا ذکر کرتے جاتے ہیں جہاں یہ مذہب رائج تھا اور جہاں بالکل ناپید تھا۔

پھر وہ مالکی مذہب کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو مذہب "اہلِ حدیث" کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اس کے اصل وطن یعنی مدینہ کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر بغداد میں اس کے ظہور اور چوتھی صدی ہجری میں اس کے زوال پذیر ہونے کا حال بیان کرتے ہیں۔ پھر اسلامی دنیا کے مغربی علاقوں میں اس کے داخل ہونے اور پھیلنے کا حال لکھتے ہیں کہ کس طرح وہ مصر اور اس سے متصلہ شمالی افریقہ کے ملکوں میں پھیل کر چھا گیا، یہاں تک کہ اندلس اور اس سے متصلہ بحرِ روم کے جزائر تک پہنچ گیا۔ پھر مشرق میں اس کے پھیلاؤ کا سراغ لگاتے ہیں جہاں وہ "رے" میں داخل ہوا، پھر ہندوستان پہنچا۔ الی آخرہ۔

وہ خاص طور پر مصر میں مالکی مذہب کے پھیلنے کا حال ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ سب سے پہلے کب مصر میں داخل ہوا اور اس کو کس نے داخل کیا۔

اس سلسلے میں مختلف روایات کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں موازنہ کر کے تطبیق دیتے ہیں۔ پھر وہ عصر حاضر میں اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ شمالی افریقہ (تونس) میں پہلے حنفی مذہب کا غلبہ تھا لیکن بعد میں مالکی مذہب غالب آ گیا۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ اندلس میں سب سے پہلے مذہب "اوزاعی" داخل ہوا اور پورے ملک پر چھا گیا۔ پھر وہاں مالکی مذہب کو امویوں نے رائج کیا اور ۲۰۰ھ کے لگ بھگ مذہب اوزاعی وہاں سے مٹ گیا۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ اندلس میں مالکی مذہب کو وہاں کے اموی سلطان نے جبراً رائج کیا تھا کیونکہ امام مالکؒ نے اس اموی سلطان کی تعریف و توصیف کی تھی اور حرم مدینہ کے حاکم پر اس کو ترجیح اور فضیلت دی تھی۔ انہوں نے اندلس کے ایک محدث سے کہا تھا کہ "ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حرم کو تمہارے بادشاہ سے زینت بخشے"۔

علامہ احمد تیمور اسی طرح مالکی مذہب کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور ہر اُس شہر اور ملک کا ذکر کرتے ہیں جہاں اس نے رواج پایا۔

بقیہ دو مذاہب یعنی شافعی اور حنبلی جن جن علاقوں میں پھیلے اُن کا بیان بھی علامہ احمد تیمور اسی طرز پر کرتے ہیں جیسے حنفی اور مالکی مذاہب کے فروغ پانے کا ذکر کرتے ہیں، جن کی چند مثالیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس قابل قدر کتاب میں تین باتیں آپ کو خاص طور پر نظر آئیں گی:

اوّل یہ کہ مصنف نے کسی امام کی سوانح حیات تفصیلی طور پر بیان نہیں کی، اور نہ اس کے اصولِ فقہ سے بحث کی ہے کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ اس کی فقہی آراء کن اصولوں پر مبنی ہیں۔ دراصل ان دونوں امور کا بیان ان کا مقصود نہیں ہے، کیونکہ ان کی فقہ اور اصولِ فقہ سے بحث کرنا ایک فقہی کام ہے جو فقہا کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کی تعلیم دیں، اس کے مبادیٔ و اصول بیان کریں اور دیگر فقہوں سے اس کا موازنہ کریں۔ رہی دوسری بات یعنی ائمہ کی سوانح حیات سو وہ ان کی کتب مناقب میں موجود ہیں، لہٰذا جو چیز تفصیلی طور پر یکجا میسر ہے اس کو پھر دُہرانا مصنف کے لئے مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا ان کی

ساری توجہ اس موضوع پر مرکوز رہی جس کا مواد متفرق کتابوں میں بکھرا ہوا تھا اور ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ اس زمانے میں کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی تھی جس میں فقہی مذاہب کے بارے میں یہ بکھری ہوئی معلومات یکجا مل جائے کہ ان مذاہب کے مخصوص علاقے کون کون سے ہیں، کس سرزمین پر وہ زیادہ پھیلے اور کہاں کہاں ان کو کم پذیرائی حاصل ہوئی۔ بالآخر استاذ احمد تیمور نے اس خلا کو پُر کیا۔ یہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔

دوسری بات آپ یہ دیکھیں گے کہ کسی فقہی مذہب کو کسی ملک یا شہر میں مستقل طور پر پورا غلبہ حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ضرور کوئی دوسرا مذہب وقتاً وقتاً اس سے مقابلہ کرتا رہا، یا کبھی اس کے غلبہ کے دوران ایک پُرامن ہمسایہ کے طور پر اس کے ساتھ موجود رہا۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے ایک مذہب کا ذکر متعدد ممالک میں کیا ہے جبکہ کسی اور مذہب کا ذکر بھی ان ممالک میں کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی ایک مذہب کسی خاص ملک میں اکثریت میں ہوگا تو دوسرا اقلیت میں۔

تیسری بات جو آپ اس وقیع کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے وہ اقتباسات کی کثرت ہے، یعنی مصنف نے اکثر جگہ اپنے ماخذوں کے اصل الفاظ نقل کئے ہیں۔ یہ بات دراصل فاضل مصنف کی پختگی اور قابلِ اعتماد ہونے کی دلیل ہے کہ وہ خود اپنے ماخذوں کے الفاظ میں اپنی بات قارئین تک پہنچا رہا ہے تاکہ قاری براہِ راست اس ماخذ کے الفاظ سے واقف ہو اور اس کو یقین ہو جائے کہ مصنف نے جو بات نقل کی ہے وہ صحیح اور سچی ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف کا علم ہمیں اس طرح منتقل کیا جائے کہ وہ ہمارے ذہن کو مخاطب کرے کیونکہ اکثر اسلاف کا کلام حکمت کی کان ہوتا ہے۔

ہمارے قدیم زمانے کے مصنفین کی تحریر و تصنیف میں یہی خصوصیت تھی جو ان کی عبقریت شمار ہوتی تھی، یعنی وہ قدیم کتب سے اقتباسات کو اس طرح منتخب کر کے باہم مرتب کرتے تھے کہ نہ ان میں کوئی جھول نظر آتا تھا اور نہ کوئی تضاد پیدا ہوتا تھا ان کی پوری عبارت میں کوئی جملہ ایسا نظر نہیں آتا تھا جو انمل بے جوڑ ہو، یا دو جملوں میں کوئی تنافر یا بیگانگی ہوتی تھی۔

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ ہر شخص انجام دے سکے، بلکہ ایک ماہر اور تجربہ کار شخص ہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر آثارِ قدیمہ کھنڈرات کے علاقہ میں ایک منہدم دیوار کے پاس آئے جس کے پتھر ٹوٹ کر ہر طرف بکھر گئے ہوں۔ وہ ماہر اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرے اور ان کو باہم جوڑ کر ایسا برتن طشت وغیرہ بنالے جو اس کے زمانے میں رائج برتنوں جیسا ہو۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ برتن ایسے ٹکڑوں کو ملا کر بنایا ہے جن میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی، لیکن اب اس نے ان کو ہم آہنگ کر لیا۔

نکتہ کی بات یہ ہے کہ علمی تحریر و تصنیف عام انشاء پردازی کی طرح نہیں ہوتی کہ حسین الفاظ استعمال کر کے یا خوبصورت جملے گھڑ کر کام چلالیا جائے، بلکہ علمی تحریر و تصنیف کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ و معانی میں مکمل ہم آہنگی ہو اور بکھرے ہوئے حقائق کو اس طرح سمیٹ کر یکجا کیا جائے کہ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل وجود نظر آئیں۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اب تک ایسے دو عظیم مصنف نہیں دیکھے جو اس قسم کی تصنیفی مہارت میں باہم ایسی مشابہت رکھتے ہوں جیسی استاذ احمد تیمورؒ اور ان کے دوست عظیم فقیہ استاذ احمد ابراہیمؒ میں پائی جاتی تھی۔

بعض لوگ جو تحریر و تصنیف میں ابھی محض طفلِ مکتب ہیں وہ اس کو بہت معمولی کام سمجھتے ہیں اور حقارت آمیز انداز میں کہتے ہیں:

"اس کتاب سے تو بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف کے پاس ایک بڑی لائبریری ہے جس کا اس نے فائدہ اٹھایا۔"

یہ جملہ میں نے اپنی جامعہ کے ایک استاذ سے سنا تھا جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے۔ ان کی طرح اور بہت سے لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ وہ تحریر و تصنیف کو محض عبارتوں کی بھرمار، اقوال کی تکرار، دوسروں کے الفاظ میں تغیر اور جملوں میں تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں، بے شک استاذ احمد تیمور مرحوم نے اپنی کتاب کو متعدد فنون کی کتابوں میں بکھرے ہوئے مواد سے جمع کر کے لکھا ہے۔ یہ کتابیں

مختلف فنون سے تعلق رکھتی تھیں، مثلاً عام تاریخ، جغرافیہ اور معاجم البلدان، تراجم علماء، مناقب ائمہ، سفر نامے وغیرہ بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ اس کے ایک صفحہ پر پانچ مآخذ کا ذکر ہے حالانکہ یہ صفحہ سولہ سطر سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کتاب کے کسی صفحہ پر دو مآخذ سے کم ماخذوں کا ذکر نہیں ہے۔

جب بھی ان ماخذوں کے بیانات میں تعارض ہوتا ہے تو وہ ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ہمیشہ اپنے قول کو اس کے مآخذ کی طرف منسوب نہ کرتے تو یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ اس میں اکثر اقتباسات ہیں جو باہم جوڑ لئے گئے ہیں۔

میں نے ایک بار سوچا کہ گن کر دیکھوں کہ انہوں نے اپنی کتاب لکھنے میں کتنی کتابوں سے مدد لی ہے تو وہ سو کے قریب نکلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو محنت و مشقت انہوں نے اس "حجم میں چھوٹی اور فائدہ میں بڑی" کتاب کی تیاری میں اٹھائی ہے اس کی میرے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے ایک علمی خلا کو پُر کیا جو ان سے پہلے کوئی نہ کر سکا تھا۔ ان کے بعد مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو اُن کے ساتھ کاندھا ملا کر چل سکتا ہو یا جو راہ انہوں نے نکالی تھی کم از کم اسی پر گامزن ہو سکتا ہو۔

ایسا ہی علمی خلا دیگر چار مذاہب کی تاریخ میں بھی موجود ہے جس کو پُر کرنے کی ضرورت ہے، یعنی مذہب زیدی، مذہب امامیہ (اثنا عشری) مذہب ظاہری اور مذہب اباضی کے ظہور اور فروغ پانے کے سلسلے میں۔

ہم نے اپنی کتابوں میں ان میں سے بعض مذاہب کے بارے میں تھوڑا بہت لکھا ہے، لیکن وہ اس سے بہت کم ہے جو عالم جلیل احمد تیمور پاشاؒ نے اپنی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو، اسلامی خدمات کے سلسلے میں ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور بعد میں آنے والوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ ان کے چھوڑے ہوئے علمی اثاثہ سے مستفید ہوں۔

اِنَّهٗ سَمِیْعٌ مُّجِیْبٌ ۔